عبد الکریم عابد

پرویز صاحب کے افکار کا شجرۂ نسب

یہ مضمون مارچ ۱۹۵۶ء میں جناب ماہر القادری مرحوم کے ماہنامہ "فاران" میں شائع ہوا تھا اس کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر اسے حکمت قرآن میں شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

(قسط اوّل)

جناب غلام احمد پرویز صاحب رسالہ "طلوعِ اسلام" اور اپنی تصنیفات کے ذریعہ ایک مخصوص قرآنی نقطۂ نظر کی تبلیغ فرما رہے ہیں اور اس نقطۂ نظر کو سمجھنے کی میں نے کوشش کی اور گزشتہ کئی برسوں سے جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں اس کا بیشتر حصّہ اس امید میں پڑھ ڈالا کہ شاید کہیں پر کوئی اچھی اور نئی بات پلّے پڑے۔ لیکن مجھے نہایت افسوس کے ساتھ یہ عرض کرنا پڑ رہا ہے کہ ان مضامین و مقالات میں نہ صرف یہ کہ کوئی جدید فکر موجود نہیں ہے بلکہ بڑی حد تک یہ خیالات چند سابقہ نظریات کا پَرتَو ہیں۔ یہ نظریات وقتاً فوقتاً اربابِ نظر اور اہلِ علم جماعت کے روبرو تنقید و تجزیہ کے لئے پیش ہوتے رہے ہیں اور بالآخر زمانے کی کسوٹی پر آزمانے کے بعد یہ مسترد کر دیئے گئے تھے اور مفکّرینِ ملّت کا کوئی سنجیدہ اور ذمّہ دار گروہ ان نظریوں کا حامل نہیں رہا۔ بلکہ اس قسم کی فکر کو "راسخون فی العلم" نے ملّت کے انتشار کا سبب قرار دیا۔

واقعہ یہ ہے کہ "طلوعِ اسلام" اور پرویز صاحب اس قدیم ذہنیت کی صدائے بازگشت ہیں جو ایک عرصہ پہلے بڑے زور و شور سے میدانِ علم و فکر میں نعرہ زن تھی۔ اس ذہنیت نے پے در پے اور مسلسل کئی تحریکات کا چولا بدلا اور طرح طرح کے سوانگ رچائے مگر غلبہ و سربلندی کی اس ساری جدوجہد کے باوجود علمائے دین کے آگے اُنکی کچھ نہ چلی اور انہیں اُمّت کے مزاجِ اجتماعی کے آگے ہتھیار ڈال دینے پڑے۔

ہماری تاریخ میں یہ تحریکیں عجمی مسلمانوں کے قبولِ اسلام سے شروع ہوتی ہیں دراصل بعض عجمی مسلمانوں کا ذہن، دماغ علمی و فکری اعتبار سے عربوں کی طرح سے سادہ نہیں تھا۔

آیت کو منسوخ کر دیا ہے یا اس حکم نے اس حکم کو منسوخ کر دیا ہے۔ چنانچہ آپ کا فرمان ہے: "وارث کے لیے وصیت کی گنجائش نہیں ہے۔" اس سے مراد آپ کی یہ وضاحت ہے کہ وصیت کی آیت والدین اور رشتہ داروں کے حکم میں منسوخ ہے اگرچہ اس کی تلاوت باقی رکھی گئی ہے۔ اور یہ حدیث کہ "اگر ایک کنواری سے ایک کنوارا زنا کرے تو ان کے لیے سو کوڑوں اور ایک سال کی جلاوطنی کی سزا ہے" دراصل سورہ نساء کی آیت ۱۵: وَاللَّاتِي يَأْتِينَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَائِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِّنْكُمْ.... (اور جو کوئی بدکاری کرے تمہاری عورتوں میں تو شاہد لاؤ ان پر چار مرد اپنے) کے حکم کو منسوخ کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی مثالیں اس نوع کی ہیں۔

پانچویں صورت

تاکید کی تشریح۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سنت کتاب اللہ کے احکامات کی موافقت و تاکید کرتی ہے۔ اور اس سے حکم الٰہی کی تاکید و تقویت مقصود ہوتی ہے۔ اس کی مثال آپ کا قول ہے: "کسی مسلمان شخص کا مال دوسرے کے لیے حلال نہیں جب تک اس کی رضا شامل نہ ہو۔" یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے فرمان: لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ[۵۵] (نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کے آپس میں ناحق) کی تائید و موافقت کرتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے: عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہا کرو۔ وہ تمہارے ہاتھوں میں بارش شدہ زمین کی مانند ہیں۔ تم نے ان کو اللہ کی امانت کے بطور حاصل کیا ہے اور اللہ کے کلمہ کے سبب ان کی شرمگاہوں کو حلال کیا ہے۔" یہ حدیث نبوی اللہ تعالیٰ کے فرمان وعاشروھن بالمعروف[۵۶] (اور گذران کرو عورتوں کے ساتھ معقول) کے ساتھ موافقت رکھتی ہے۔

بقیہ: حکمتِ اقبال

نے کے بعد ان کو سچ مچ کی علمی حقیقتیں بنایا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اوپر کی مثال میں دوسرا نقاش فنکار پہلے فنکار کے نامکمل خاکہ یا اس کی نامکمل تصویر کو صرف اسی صورت میں مکمل کر سکے گا کہ وہ پہلے فنکار کے وجدانی تصوّرِ حسن سے پوری طرح واقف ہو چکا ہو۔

(جاری ہے)

عبد الکریم عابد

پرویز صاحب کے افکار کا شجرۂ نسب

یہ مضمون مارچ ۵۶ ۱۹ء میں جناب ماہرالقادری مرحوم کے ماہنامہ 'فاران' میں شائع ہوا تھا اس کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر اسے حکمت قرآن میں شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

(قسط اوّل)

جناب غلام احمد پرویز صاحب رسالہ "طلوعِ اسلام" اور اپنی تصنیفات کے ذریعہ ایک مخصوص قرآنی نقطۂ نظر کی تبلیغ فرما رہے ہیں اور اس نقطۂ نظر کو سمجھنے کی میں نے کوشش کی اور گزشتہ کئی برسوں سے جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں اس کا بیشتر حصہ اس امید میں پڑھ ڈالا کہ شاید کہیں پر کوئی اچھی اور نئی بات پتے پڑے۔ لیکن مجھے نہایت افسوس کے ساتھ یہ عرض کرنا پڑ رہا ہے کہ ان مضامین و مقالات میں نہ صرف یہ کہ کوئی جدید فکر موجود نہیں ہے بلکہ بڑی حد تک یہ خیالات چند سابقہ نظریات کا پرتو ہیں۔ یہ نظریات وقتاً فوقتاً اربابِ نظر اور اہلِ علم جماعت کے روبرو تنقید و تجزیہ کے لیے پیش ہوتے رہے ہیں اور بالآخر زمانے کی کسوٹی پر آزمانے کے بعد یہ مسترد کر دیئے گئے تھے اور مفکرینِ ملّت کا کوئی سنجیدہ اور ذمہ دار گروہ ان نظریوں کا حامل نہیں رہا۔ بلکہ اس قسم کی فکر کو "راسخون فی العلم" نے ملّت کے انتشار کا سبب قرار دیا۔

واقعہ یہ ہے کہ "طلوعِ اسلام" اور پرویز صاحب اس قدیم ذہنیت کی صدائے بازگشت ہیں جو ایک عرصہ پہلے بڑے زور و شور سے میدانِ علم و فکر میں نعرہ زن تھی۔ اس ذہنیت نے پے درپے اور مسلسل کئی تحریکات کا چولا بدلا اور طرح طرح کے سوانگ رچائے مگر غلبہ و سربلندی کی اس ساری جدوجہد کے باوجود علمائے دین کے آگے اُن کی کچھ نہ چلی اور انہیں امّت کے مزاجِ اجتماعی کے آگے ہتھیار ڈال دینے پڑے۔

ہماری تاریخ میں یہ تحریکیں عجمی مسلمانوں کے قبولِ اسلام سے شروع ہوتی ہیں دراصل بعض عجمی مسلمانوں کا ذہن، ودماغ علمی و فکری اعتبار سے عربوں کی طرح سے سادہ نہیں تھا۔

کہ اس پر قرآن فوراً ہی نقش ہو جائے بلکہ فلسفہ "علم کلام" مذہبیات وغیرہ کی طول طویل بحثوں اور نزاکتوں نے بعض عجمی مسلمانوں کو قرآن کے بارے میں ایک نئے زاویۂ نگاہ کی تلاش پر مائل کیا، مصر اور اسکندریہ کے علمی مراکز میں جب اسلام پہنچا تو فطری طور پر نئے نئے مسائل پیدا ہوئے اور اُن کا جواب دینے کے نئے نئے طریقے اختیار کئے گئے۔ یہ بات اصولاً تو بُری نہ تھی مگر انتہا پسندانہ جذبات کی کشمکش نے فکر کے اس دھارے کا رُخ غلط سمت پر موڑ دیا اور یہی وہ منزل تھی جہاں پر غیر عربی مسلمانوں نے اپنے قدیم مسلک میٹریلزم (Materialism) اور اپنے مخصوص تاریخی طرزِ فکر رشنلزم (Rationalism) کو عام کرنے کے لئے علمائے دین کے خلاف ذہنی و عملی ریشہ دوانیوں کے سلسلہ کا آغاز کیا۔ انسانی ذہن و دماغ اس عالمِ آب و گِل میں محدود ہونے کی وجہ سے خود بخود مادّہ پرستی کی جانب جھکا ہوا ہے، انبیاء کرام کی بعثت اس مادّہ پرستانہ رجحان کو کم کرنے کے لئے عمل میں آئی مگر افسوس کہ پیروانِ مذاہب نے مذہب کو بھی مادّی اقدار کے مطابق کر دیا ـــــ مذہب یہ چاہتا ہے کہ ہماری زندگی کا ارتقا اس تیرہ و تاریک عقل کی رہنمائی میں نہ ہو جس کے اردگرد خواہشات نے بے شمار زنجیریں بنا رکھی ہیں۔ بلکہ ہم وحی کی روشنی میں اپنا راستہ طے کریں۔ لیکن عقل کی دیوی خدا کی بجائے اپنی پرستش بہرحال کرانا چاہتی ہے۔ اس لئے جب لامذہبیت کے مندر سُونے ہو جاتے ہیں تو مذہب کے مقدّس ایوانوں میں اس دیوی کا بُت نصب کیا جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ اس بُت کے سامنے وحیِ الٰہی بھی سجدہ ریز ہو جائے۔

اسلام کو بھی مادّہ پرستی اور عقل پرستی کے ان فتنوں کا مقابلہ دو مختلف محاذوں پر کرنا پڑا۔ ایک محاذ تو باہر والوں کے لئے کھُلا تھا اور دوسرے کا رُخ اندرونِ ملّت کے مادّہ پرستوں اور عقل پرستوں کی جانب رہا۔

ملّتِ اسلامی کے افکار کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے دوران میں ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی قرون میں مسلمان علمی اعتبار سے دو مختلف جماعتوں میں منقسم تھے۔ ان میں ایک گروہ علمائے دین ہیں اور دوسرا انہی مذہبی رشنلسٹوں اور مادّہ پرستوں کا ہے۔ ان کے

کشمکش ہماری تاریخ میں بالکل نمایاں ہے اور پرویز صاحب جیسے لوگ جب اسے دیکھتے ہیں تو انہیں آخرالذکر گروہ کے بارے میں یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ وہ واقعی ترقی پسند، وسیع النظر اور سائنٹیفک مزاج کا مالک ہے۔ اس لئے وہ ان کی تقلید کو باعث فخر جانتے ہیں اور علمائے دین کے بارے میں یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ وہ تنگ نظر، ترقی دشمن اور رجعت پسند ہیں یہی وجہ ہے کہ ' طلوعِ اسلام ' کے پرچوں میں آئمہ اور علمائے دین کو گالیاں دی جاتی ہیں اور اُن کے برخلاف اکثر وبیشتر اکابرینِ معتزلہ کی سوانح حیات اور اُن کے کارناموں کی تفصیل شائع ہوتی رہتی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ " طلوعِ اسلام" کے قاری کو معتزلہ کی شان میں یہ الفاظ بھی اس پرچہ میں لکھے نظر آتے ہیں کہ :

" اگر مسلکِ اعتزال باقی رہتا تو یہ جمود و تعطل جو آج ہمیں نظر آرہا ہے، وجود میں نہ آتا اور علم وفکر کی دنیا میں آج مسلمان ایسے مقام پر کھڑے ہوتے جہاں کوئی ان کا مقابل نہ ہوتا۔"

(طلوعِ اسلام ۔ ہفتہ وار ۳۰ جولائی ۱۹۵۵ء)

کیا واقعی مسلکِ اعتزال ان برکتوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے تھا۔ جو مندرجہ بالا اقتباس میں بیان کئے گئے ہیں۔ یا یہ ایک خطرناک غلط فہمی ہے ! اس کا تصفیہ کسی غیر جانبدار ہی سے سُن لیجئے ۔ ایک مشہور یورپین عالم کہتا ہے کہ :

" معتزلہ کی عقلیت کا اسلام کے نظامِ فکر میں جذب ہونا دشوار تھا۔ اگر اعتزال کی تحریک کامیاب ہوتی تو اسلامی ثقافت انتشار اور برہمی کا شکار ہو جاتی اور اسلام کو اس سے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچتا۔ اُن کی علمی کاوشوں نے راسخ العقیدہ مسلمانوں کو بھی کسی حد تک اپنا ہمنوا بنا لیا تھا ۔ لیکن جب معتزلہ کی انتہا پسند جماعتوں نے اسلامی عقائد کو یونانی تصوّرات کے سانچے میں ڈھالنا شروع کیا اور قرآن کریم کی بجائے اپنے دینی عقائد یونانی فلسفہ سے اخذ کرنے شروع کئے تو آخرالذکر طبقہ نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔"

(ماخوذ از ایچ ، اے ، آر گب)

اس فرقہ کی پیدائش کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ ایک زمانے میں جبکہ یونانی سائنس اور یونانی علوم کے چرچے سے دُنیائے علم میں ہر طرف شور بپا تھا تو کچھ لوگوں کو یہ شوق چرایا

کہ وہ کتاب و سنت کو عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے پیش کریں اور اس مقصد کی تکمیل کیلئے انہوں نے قرآن کی ایسی تفسیریں لکھیں جو یونانی سائنس اور فلسفہ کے بالکل مطابق تھیں۔ اس گروہ کا یہ خیال کہ قرآن کو اپنے زمانے کے علوم و رجحانات اور بالخصوص یہ کہ اپنے دور کے سائنسی خیالات کے مطابق بنایا جائے، کچھ اس طرح کا تھا کہ اس کی وجہ سے قرآن قطب نما کی ایک سوئی کی طرح سمت بدلنے پر حرکت کرتا۔ ظاہر ہے کہ ہر دور میں سائنس اور فلسفہ بدلتے رہے ہیں، اب اگر قرآن کے معانی و مفہوم کو ہر سائنسی تغیر اور ہر فلسفیانہ تبدیلی کے ساتھ بدل جانا پڑے تو پھر ایک قرآن کے ان گنت روپ پیدا ہو جائیں گے اور ہر روپ نرالا ہوگا۔ دوسرے معنوں میں یہ طرز فکر ہر نئے دور کے مسلم کو اپنے سے پچھلے دور کے مسلم سے کاٹ کر رکھ دے گا۔ پھر صرف یہی نہیں بلکہ چونکہ فلسفیوں اور سائنس دانوں میں خواہ وہ ایک ہی عرصہ اور زمانہ کے کیوں نہ ہوں، اختلافات اور بنیادی و اصولی اختلافات اکثر و بیشتر رہتے ہیں۔ اس لئے قرآن و سائنس کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش عملاً افتراق و پراگندگی کے سوا کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں کر سکتی۔

اگر ہم خالی الذہن ہو کر قرآن پر غور کریں تو یہ ممکن ہے کہ قرآن ہم سب کو ایک ہی پیام دے لیکن اگر مختلف سائنسدانوں اور فلسفیوں کے خیالات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے قرآن پڑھا جائے گا تو قرآن کا پیام بھی الگ الگ ہو جائے گا۔ اس طرح وہ افتراق جو سائنس کی دنیا میں ہے آگے بڑھ کر مذہب کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔

سچ تو یہ ہے کہ قرآن نہ سائنس کی کتاب ہے نہ فلسفہ کی۔ اس میں سائنس اور فلسفہ کے موضوعات تلاش کرنا اسی طرح فعل عبث ہے جس طرح کہ کوئی شخص اگر یہ چاہے کہ میں قرآن سے علم طب کے نظریات معلوم کروں۔ وحی الٰہی تو اخلاق کے مسلمہ اصولوں، مذہب کے معروف نظریوں، خیر اور اچھائی کی عالم گیر قدروں کو فروغ دینے کے لئے ظاہر ہوتی ہے۔ اسے سائنس یا فلسفہ کی بھول بھلیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ سمجھنا کہ قرآن بعض سائنسدانوں کی حمایت یا بعض کی مخالفت کے لئے نازل ہوا ہے، سخت حماقت ہے۔ کسی بھی مذہبی صحیفہ کو دیکھ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس نے کہیں بھی اپنے

دعوے کی تائید میں فلسفہ اور سائنس کی کوئی دلیل نہیں دی ہے، بلکہ وہ سیدھے سادے طریقہ پر انسان کے شریف اور نیک احساسات کو ذریعہ تفہیم قرار دیتا ہے اور پند و نصیحت، عبرت و موعظت دلانے کے فطری و آسان طریقے پر عمل پیرا ہے۔ اس حقیقت کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے یوں بیان کیا ہے کہ:

"انبیاء کے اصول میں سے ایک یہ ہے کہ وہ لوگوں سے ان کی خلقی عقل کے موافق خطاب کرتے ہیں انبیاء نے محض اس فہم و ادراک کے لحاظ سے خطاب کیا جو لوگوں کی خلقت میں ودیعت ہے۔" (حجۃ اللہ البالغہ، جلد اوّل ص۸۸)

انسانی فطرت میں پوشیدہ نیکی کی طاقت اور عام اوسط درجہ کی سمجھ بوجھ کی استعداد قرآن کے اساسی افکار کو سمجھنے کے لئے کافی ہے تو اللہ تعالیٰ خواہ مخواہ سائنس اور فلسفہ کی پیچیدہ اور مشکل زبان میں کس لئے خطاب فرماتا! ہر کتاب کا ایک موضوع ہوتا ہے اور قرآن کا موضوع "ھدایت" ہے۔ قرآن میں انفس و آفاق کی، ارض و فلک کی، سفینہ و بحر کی، بادلوں اور ہواؤں کی جو مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ اُن کا مقصد یہ ہے کہ ان نشانیوں کو دیکھ کر انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا یقین پیدا ہو اور جو دل اس یقین کی دولت سے مالا مال ہیں اُن کی اس دولت میں اور اضافہ ہو جائے!

قرآن مجید کا طرزِ خطاب سائنس اور فلسفہ کے انداز پر نہیں ہے اور نہ یہ علوم اس کے موضوع ہیں ـــــ معتزلیوں نے قرآن کو سمجھنے میں جو ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ انہوں نے قرآنی اصطلاحات کو فلسفیانہ مباحث کا "لباسِ ناموزوں" پہنانے کی کوشش کی ہے۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ قرآن رُوح کو "امرِ ربّی" بتاتا ہے۔ تو اُن کا ذہن "امر" کے سادہ اور عام فہم معنی کو نظر انداز کر کے فلسفۂ یونان کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ جہاں لفظ "امر" یا "کلام" ایک خاص اصطلاح کے طور پر مستعمل ہوتا ہے۔ اب آپ انہیں لاکھ سمجھائیے کہ صاحب! یہاں لفظ "امر" کے معنی وہی ہیں جو روزمرّہ کی زبان میں مراد لئے جاتے ہیں۔ مگر قرآن سے فلسفہ ثابت کرنے کا جنون انہی سے یہی کہلوائے گا کہ نہیں نہیں یہاں "امر" سے مطلب وہی "کلام" ہے جو فلسفۂ یونان کی خاص اصطلاح ہے اور یوحنا نبی کی انجیل میں جو اس طرح بیان ہوا ہے۔

"ابتدا میں کلام تھا۔ کلام خدا کے ساتھ تھا۔ اور کلام ہی خدا تھا۔ سب چیزیں کلام کے وسیلے سے پیدا ہوئیں اور بغیر کلام کچھ بھی پیدا نہ ہوا۔"

اب آپ ہی بتائیے کہ اس ٹیڑھی ذہنیت کا کیا علاج! یہ وہی ذہنیت ہے جس نے ملائکہ کا مطلب یونانی فلسفیوں کی اصطلاح "عقول عشرہ" کو جانا اور جس نے یونانی سائنسدانوں کے اس قیاسی نظریہ کی تصدیق قرآن سے کی کہ آسمانوں کی تعداد کل نو ہے اور وہ ہمیشہ حرکت کرتے رہتے ہیں۔

قرآن اخلاق کی کتاب ہے، مذہب کا صحیفہ ہے یا فلسفہ کی تصنیف یہ معلوم کرنے سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ مگر خواہ مخواہ آیاتِ قرآنی کو قیاسی اور فلسفیانہ موشگافیوں کی خراد پر رکھنا اُن کے نزدیک تجدید اسلام ہے، یہی حال سائنس کا سمجھئے۔ قرآن ان مسائل سے بحث نہیں کرتا کہ زمین گول ہے یا چپٹی، ساکن ہے یا متحرک، آسمان ٹھوس مادّہ ہے یا خیالی فضا۔ سورج زمین کے گرد گھوم رہا ہے یا زمین سورج کے گرد طواف کر رہی ہے۔ یہ سب تو آپ کی دلچسپی اور کام کی چیزیں ہیں۔ انہیں اپنے طور پر پڑھئے پڑھائیے۔ قرآن کو ان مباحث میں الجھانا خود قرآن کی "جامعیت" کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے؟

یہ وہ حقیقتیں تھیں جو حضرات علماء نے معتزلہ کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی۔ لیکن افسوس کہ اپنے زعم علمی میں اس سرشار و بدمست جماعت نے اس قابل احترام گروہ کو ملّا، رجعت پسند اور ترقی دشمن کہہ کر نظر انداز کر دیا۔ اور بالآخر یہ لوگ وہ کام کر گئے جس کے تلخ خمیازے اب تک ہمیں بھگتنے پڑ رہے ہیں۔ ان معتزلیوں نے اپنے عظیم لٹریچر کے توسّط سے یہ خیال علمی دنیا میں عام کر دیا کہ قرآن یونانی سائنس اور یونانی فلسفہ کی کلیات و جزئیات کا مصدّق ہے۔ اور پھر جب بعد میں یونان کے علم و فکر کا قصرِ بلند دھڑام سے زمین پر گر گیا تو اس کے ساتھ ہی قرآن اور علم بردارانِ قرآن بھی اس قصرِ عالی شان کے ملبہ کے نیچے دب کر رہ گئے۔

اب آج جو شخص معتزلیوں کی تقلید میں یہ فکر کر رہے ہیں کہ قرآن کو موجودہ زمانے کی یورپین سائنس اور فلسفہ سے مطابقت دی جائے انہیں عبرت حاصل کرنی چاہیئے اور زمانہ حال کے علماء کے اس اعتراض کا وزن محسوس کرنا چاہیئے کہ اگر قرآن جدید یورپین سائنس اور

جدید یورپی فلسفہ کے مطابق ہے تو یہ اس کی بڑی خامی ہے۔ کیونکہ اس کے معنی ہی یہ ہوں گے کہ قرآن صرف اس مخصوص دور میں تو صحیح ہے اور باقی آنے والے ادوار جو کہ آج سے قطعی مختلف ہوں گے اُن میں غلط ثابت ہو جائے گا۔ کیونکہ یہ حقیقت خود یورپ کے سائنسدان اور فلسفی بھی مانتے ہیں کہ کل کی دنیا سائنس و فلسفہ کے اعتبار سے آج کی دنیا کے مقابلہ میں نہ صرف زیادہ ترقی یافتہ بلکہ مختلف ہوگی اور اس صورت میں قرآن جو کہ رائج الوقت سائنس و فلسفہ سے ہم آہنگ ہے۔ کل کے روز (حاکم بدہن گستاخ) تقویم پارینہ اور Out of date ہو کر رہ جائے گا۔

مثلاً چند دنوں پہلے نیوٹن کے قیاسات ساری علمی دنیا کے نزدیک مسلّم تھے۔ مگر اب ایک بچہ بھی ان کی غلطیوں پر احتساب کر سکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ اُس زمانے میں قرآن اور نیوٹن کو ایک دوسرے کا مصدق بنا دیا جاتا تو آج نیوٹن کے ساتھ قرآن کی قدر و قیمت بھی یقیناً متاثر ہوتی۔ پھر سوچئے کہ سائنس دانوں کی سائنس کسی ایک دور میں بھی ایک نہیں رہی۔ مثلاً آئن سٹائین کو لیجئے۔ اُن کے بعض نظریوں کی کچھ فلسفی تردید کر رہے ہیں اور کچھ ریاضی دان اس کی تائید کر رہے ہیں۔ اب بتائیے کہ ہم تردید کرنے والوں یا تائید کرنے والوں میں کسے سچا سمجھیں اور پھر تائید کرنے والوں کا یہ حال ہے کہ وہائٹ ہیڈ کے نزدیک آئن سٹائین کے نظریوں کی ایک تفسیر ہے تو جیمس جینس کے نزدیک دوسری اور بقیہ لوگوں کے پاس اپنی الگ تعبیر ہے۔ اب بتائیے کہ ہم ان میں کس کو آئین سٹائن کا واقعی شارح سمجھیں۔

جب ایک سائنسدان کی تصدیق کے لئے اتنے جھگڑے ہیں تو پھر پورے علم سائنس اور سارے سائنسدانوں کی قرآن سے تصدیق کیسے ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ علمار دین سائنس و فلسفہ کی تحصیل کو ناجائز نہ جاننے کے باوجود قرآن و سائنس اور قرآن و فلسفہ کو ہم آہنگ اور ایک کر دینے کے نظریہ کی مذمت کرتے ہیں اور اگر علمار کے اس طرز فکر کی خوبی آپ کو معلوم ہوتی تو جناب اپنی تفسیر معارف القرآن میں قصہ آدم و ابلیس، ارتقار وغیرہ کے عنوانات سے جدت طرازیاں ہرگز نہ کرتے اور نہ یہ کہتے کہ:

"قرآن نے عالم کا لفظ "سائنٹسٹ" کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔" (تاریخ زوال امت ص۹)

کوئی شک نہیں کہ قرآن عقل و فطرت کے عین مطابق ہے۔ مگر اس کے بعض حقائق

ایسے بھی ہیں جن کا عقل پورے طور پر احاطہ نہیں کر سکتی۔ اگر قرآن کے پیش کئے ہوئے تمام حقائق ریاضی کے مسلّمات کی طرح سمجھ میں آجاتے تو پھر " ایمان بالغیب " کے لئے کیوں حکم دیا جاتا۔ قرآن پاک جہاں انفس و آفاق کے مشاہدے اور فکر و تدبر کی دعوت دیتا ہے۔ وہاں " ایمان بالغیب " کا بھی حکم دیتا ہے۔ کتاب و سنّت کے اسی قسم کے حقائق کی جن پر "ایمان بالشہود" کا نہیں "ایمان بالغیب" کا حکم دیا گیا ہے۔ معتزلیوں نے عقلی توجیہات پیش کرنی شروع کیں۔ اپنی دانست میں تو وہ قرآن کی سائنٹیفک تشریح و تفسیر پیش کر رہے تھے مگر دراصل ان خدا کے ضرورت سے زیادہ عقل مند بندوں سے تحریف قرآن کے جرم کا ارتکاب ہو رہا تھا!

مسلمانوں کا دورِ نبوی میں یہ عقیدہ رہا ہے کہ انبیاء کرام کو اللہ تعالیٰ نے بعض غیر معمولی قوتیں بھی عطا فرمائی ہیں۔ معجزات انہی قوتوں کے باعث ظہور میں آتے ہیں۔ مگر یہ عقیدہ عقلیت اور ریشنلزم کے ساتھ نبھ نہیں سکتا۔ اس لئے ابومسلم اصفہانی نے ایک ایسی تفسیر لکھی جس میں معجزات کے متعلقہ ساری آیاتِ قرآنی کو جدید تشریح کی بھول بھلیوں میں پہنچا دیا۔ حتیٰ کہ اس شخص نے مشہور معجزات کے ساتھ ساتھ اس مسلّمہ تاریخی واقعہ سے بھی انکار کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی پیدائش بغیر باپ کے ہوئی تھی۔

" ایمان بالغیب " میں جب عقل دخل در معقولات سے کام لے گی، ٹھوکر کھائے گی اور منزل حقیقت تک پہنچنے کی بجائے گمراہی کی طرف چل پڑے گی!

بقیہ : سالانہ محاضراتِ قرآنی

ثقافتِ اسلامیہ کے ڈائریکٹر جناب سراج منیر صاحب مقالات پیش فرمائیں گے۔

محاضرات کی دیگر نشستوں میں جن مقررین و مقالہ نگار حضرات کی شرکت متوقع ہے اُن میں مدیر تکبیر جناب صلاح الدین، روزنامہ جسارت کے بیورو چیف جناب عبدالکریم عابد، حیدرآباد کے پروفیسر ایس ایم سعید، پروفیسر سید قوی احمد اور میاں ظفر احمد اور لاہور کے پروفیسر احمد یار صاحب کے نام قابل ذکر ہیں۔ محاضرات کی مفصل رپورٹ آئندہ ماہ ہدیہ قارئین کی جائے گی!